Version No.			

ROLL NUMBER						

⓪	⓪	⓪	⓪
①	①	①	①
②	②	②	②
③	③	③	③
④	④	④	④
⑤	⑤	⑤	⑤
⑥	⑥	⑥	⑥
⑦	⑦	⑦	⑦
⑧	⑧	⑧	⑧
⑨	⑨	⑨	⑨

⓪	⓪	⓪	⓪	⓪	⓪	⓪
①	①	①	①	①	①	①
②	②	②	②	②	②	②
③	③	③	③	③	③	③
④	④	④	④	④	④	④
⑤	⑤	⑤	⑤	⑤	⑤	⑤
⑥	⑥	⑥	⑥	⑥	⑥	⑥
⑦	⑦	⑦	⑦	⑦	⑦	⑦
⑧	⑧	⑧	⑧	⑧	⑧	⑧
⑨	⑨	⑨	⑨	⑨	⑨	⑨

Answer Sheet No._____

Sign. of Candidate_____

Sign. of Invigilator_____

اردو(لازمی)برائے بارہویں جماعت (3rd Set Solution)

ماڈل سوالیہ پرچہ(کریکلم2006ء)

حصہ اوّل(کل نمبر:20،وقت:25منٹ)

حصہ اول لازمی ہے۔اس کے جوابات اسی صفحہ پر دے کر ناظم مرکز کے حوالے کریں۔کاٹ کر دوبارہ لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔**لیڈ پنسل کا استعمال ممنوع ہے۔**

سوال نمبر1: ہر جزو کے سامنے دیے گئے درست دائرہ کو پر کریں۔

(1) "بھیجنا خط کا کیا،اس بت نے بند"میں "بت"کیا ہے؟

(A) کنایہ ◯ (B) استعارہ ◯

(C) تشبیہ ◯ (D) مجاز مرسل ◯

(2) ذیل میں سے مرکب عطفی کی نشاندہی کریں؟

(A) گرم موسم ◯ (B) احمد کی کتاب ◯

(C) صبح وشام ◯ (D) اسلم نے پڑھا ◯

(3) سکتہ کی علامت کون سی ہے؟

(A) ، ◯ (B) ؛ ◯

(C) ؟ ◯ (D) ! ◯

(4) ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا،نہ وہ دنیا یہاں مرنے کی پابندی،وہاں جینے کی پابندی

اس شعر میں کون سی صنعت استعمال ہوئی ہے؟

(A) تلمیح ◯ (B) لف ونشر ◯

(C) حسنِ تعلیل ◯ (D) تجنیس ◯

(5) "کتاب میز پر رکھ دو"اس مثال میں "دو"کون سا فعل ہے؟

(A) معاون فعل ◯ (B) اصل فعل ◯

(C) فعل ماضی ◯ (D) فعل مستقبل ◯

(6) ایسی نظم جو قافیوں کی خاص ترتیب سے پہچانی جائے اور چودہ مصرعوں پر مشتمل ہو کیا کہلاتی ہے؟

(A) ہائیکو ◯ (B) مثنوی ◯

(C) سانیٹ ◯ (D) نظم معریٰ ◯

(7) وہ جملے جن کا باہم مقابلہ کیا مگر، لیکن، اور، پر، بلکہ، سو وغیرہ استعمال ہوں کیا کہلاتے ہیں؟

(A) وصفی جملے ◯ (B) تمیزی جملے ◯

(C) استدراکی جملے ◯ (D) سببی جملے ◯

(8) "بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ" یہ جملہ کس نثر کی مثال ہے؟

(A) عاری ◯ (B) مقفیٰ ◯

(C) مسجع ◯ (D) نثری ◯

(9) آمنہ کی جائیداد، دکانیں، پلازے اور مکان سب کچھ تباہ _____ ؟

(A) ہو گیا ◯ (B) ہو گئے ◯

(C) ہو گئ ◯ (D) ہو گئیں ◯

(10) "اے ماؤ! بہنو! بیٹیو!" اس مصرعے میں کون سی علامت کا استعمال ہوا ہے؟

(A) قوسین ◯ (B) ندائیہ ◯

(C) واوین ◯ (D) خط ◯

(11) زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس شعر میں علم بیان کی کون سی قسم ظاہر ہوئی ہے؟

(A) تشبیہ ◯ (B) استعارہ ◯

(C) کنایہ ◯ (D) مجاز مرسل ◯

(12) درست جملے کا انتخاب کریں۔ "ادبی دنیا" بند ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(A) چکا ہے ◯ (B) چکی ہے ◯

(C) چکے ہیں ◯ (D) چکی ہیں ◯

(13) وہ الفاظ جو فعل کی کیفیت یا حالت میں کمی بیشی کرتے ہیں کیا کہلاتے ہیں؟

(A) معاون فعل ◯ (B) متعلق فعل ◯

(C) اصل فعل ◯ (D) سلینگ ◯

(14) کسی موضوع پر نثر میں اپنے خیالات کو مربوط اور منظم انداز میں پیش کرنا کہ قاری لطف اندوز اور متاثر ہو کیا کہلاتا ہے؟

(A) انشائیہ ◯ (B) سوانح ◯

(C) مضمون ◯ (D) خاکہ ◯

(15) " تری تصویر اور مہکتے پھول"، "کارنس پر سجا رکھے ہیں"، "تتلی تصویر پر کیوں بیٹھی ہے" ان اشعار سے کون سی صنف شاعری ذہن میں آتی ہے؟

(A) بیت ◯ (B) قطعہ ◯

(C) رباعی ◯ (D) ہائیکو ◯

(16) جملہ معترضہ کے شروع اور آخر میں کون سی علامت لگائی جاتی ہے؟

(A) حذف ◯ (B) واوین ◯

(C) قوسین ◯ (D) ندائیہ ◯

(17) ایسی تحریر جس میں لکھنے والا اپنے حالات وواقعات خود لکھتا ہے، کیا کہلاتی ہے؟

(A) سوانح عمری ◯ (B) آپ بیتی ◯

(C) جگ بیتی ◯ (D) انشائیہ ◯

(18) "ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات آٹھ، نو، دس بس انشآبس" اس شعر میں کون سی صنعت استعمال ہوئی ہے؟

(A) صنعتِ تجنیس ◯ (B) صنعتِ سباقۃ اعداد ◯

(C) صنعتِ تفریق ◯ (D) صنعتِ جمع ◯

(19) رند قواعد کی رو سے کیا ہے؟

(A) تخلص ◯ (B) عرف ◯

(C) کنیت ◯ (D) خطاب ◯

(20) "سورج آہستہ آہستہ نکلتا ہے" اس جملے میں متعلق فعل کون سا ہے؟

(A) سورج ◯ (B) آہستہ آہستہ ◯

(C) نکلتا ◯ (D) ہے ◯

درست جوابات:

(1)	B	(2)	C	(3)	A	(4)	B
(5)	A	(6)	C	(7)	C	(8)	B
(9)	A	(10)	B	(11)	A	(12)	A
(13)	B	(14)	C	(15)	C	(16)	C
(17)	B	(18)	B	(19)	A	(20)	B

فیڈرل بورڈ امتحان برائے بارہویں جماعت
اردو (لازمی) ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006)

وقت: 2:35 گھنٹے　　کل نمبر:80

نوٹ: حصہ دوم اور سوم میں دیے گئے سوالات کے جوابات علیحدہ سے مہیا کی گئی جوابی کاپی پر دیں۔ آپ کے جوابات صاف اور واضح ہونے چاہئیں۔

حصہ دوم (کل نمبر 36)

سوال نمبر2: (الف) حصہ نثر:

پیراگراف پڑھ کر آخر میں دیے گئے سوالات میں سے پانچ کے جوابات لکھیں: (5x3=15)

پرسوں یہ سوال میں نے اس کے بوڑھے ڈرائیور سے کیا، تو وہ ہنسنے لگا۔ بولا: اس اللہ لوک نے کہاں جانا ہے بابو جی! ساری زندگی اسی علاقے میں دھونی رمائے پڑا رہا ہے۔ مگر جناب! میں نے کئی روڈ رولرز پر کام کیا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔ بوڑھے ڈرائیور کے یہ الفاظ سن کر مجھے خیال آیا کہ اصل مارکوپولو یا ابنِ بطوطہ تو یہ ڈرائیور ہے جس نے روڈ رولر کی رفتار سے سیاحت کی ہے نہ کہ اسپِ تازی، یا کھڑ کھڑ چلتی گاڑی کی رفتار سے! سو میں نے اس سے کہا کہ کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ روڈ رولر پر بیٹھنے کا موقع دو۔ وہ خوش ہو گیا۔ کہنے لگا میں پچھلے پچاس سال سے روڈ رولر چلا رہا ہوں۔ آپ پہلے شخص ہیں، جس نے روڈ رولر پر بیٹھنے کی خواہش کی ہے۔ میں نے کہا کیا کروں، میں خواہش ہی کا تو مارا ہوا ہوں۔ سو پروگرام طے پا گیا۔

سوالات:

i. ساری زندگی روڈ رولر کہاں پڑا رہا؟

جواب: ساری زندگی روڈ رولر اسی علاقے میں دھونی رمائے پڑا رہا ہے۔

ii. بقول مصنف اصل میں ڈرائیور کون تھا؟

جواب: بقول مصنف ڈرائیور در حقیقت اصل مارکوپولو اور ابنِ بطوطہ ہی ہے جس نے روڈ رولر کی رفتار سے سیاحت کی ہے نہ کہ اسپ تازی یا کھڑ کھڑ چلتی گاڑی کی رفتار سے۔

iii. "گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں" اس جملے کی وضاحت کریں۔

جواب: اس سے مراد یہ ہے کہ ڈرائیور نے کئی روڈ رولرز پر کام کیا ہے جن کی وجہ سے وہ مختلف مقامات کی سیر کر چکا ہے یعنی وہ جگہ جگہ گھوما پھرا ہے۔

iv. مصنف نے ڈرائیور سے کیا کہا؟

جواب: مصنف نے ڈرائیور سے یہ کہا کہ " کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ روڈ رولر پر بیٹھنے کا موقع دو۔"

v. مصنف کی خواہش پر ڈرائیور نے کیا کہا؟

جواب: مصنف کی خواہش پر ڈرائیور نے حیرت سے کہا کہ آپ پہلے شخص ہیں، جس نے روڈ رولر پر بیٹھنے کی خواہش کی ہے۔

vi. "میں تو خواہش کا مارا ہوا ہوں" سے مصنف کی کیا مراد ہے؟

جواب: اس جملے سے مصنف کی یہ مراد ہے کہ انسان خواہشات کا پُتلا ہے، خواہشات اس کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنی زندگی میں قدم قدم پر خواہشات پالتا ہے اور پھر اپنی ان آرزوؤں کی تکمیل چاہتا ہے جس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور ناکام ہونے کی صورت میں پریشان ہو جاتا ہے۔

vii. اس پیراگراف کی تلخیص کریں۔

جواب: بوڑھے ڈرائیور نے بتایا روڈ رولر ساری زندگی اسی علاقے میں دھونی رمائے پڑا رہا ہے اور میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔ اصل مارکوپولو یا ابنِ بطوطہ تو یہ ڈرائیور ہے جس نے روڈ رولر کی رفتار سے سیاحت کی ہے۔ مصنف نے روڈ رولر پر بیٹھنے کی خواہش کی کیونکہ وہ خواہش کا مارا ہوا تھا یعنی اپنی آرزوؤں کی تکمیل چاہتا تھا۔

(ب) **حصہ نظم:**

مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھ کر آخر میں دیے گئے سوالات میں سے تین کے جوابات لکھیں: **(3 x3=9)**

وہ روح میں انوارِ خدا، صبح وہ صادق — وہ حسن جسے دیکھ کے ہر آنکھ ہو عاشق
وہ سادگی انسان کی فطرت کے مطابق — زریں وہ اُفق، نور سے لبریز وہ مشرق
وہ نغمۂ داؤدؑ پرندوں کی صدا میں — پیراہنِ یوسفؑ کی وہ تاثیر ہوا میں

سوالات:

i. آنکھ کسے دیکھ کر عاشق ہے؟

جواب: صبح صادق کے وقت روح میں انوارِ خدا یعنی خدا کے جلوے روح کو سیر اب کرتے ہیں یہ ایسا خوب صورت اور روح پرور حسن ہے جسے دیکھ کر ہر آنکھ عاشق ہو جاتی ہے۔

ii. مشرق کس سے لبریز ہے؟

جواب: صبح صادق کے وقت مشرق کی طرف نگاہ اٹھائیں تو وہ سورج کی روشنی سے لبریز دکھائی دیتا ہے یعنی سنہری افق اور پر نور کرنوں سے مشرق لبریز ہے۔

iii. نغمۂ داؤد اور پیراہن یوسف کون سی صنعتیں ہیں؟ وضاحت کریں۔

جواب: نغمۂ داؤد اور پیراہن یوسف صنعت تلمیح ہیں۔ (تلمیحات) نغمۂ داؤد سے مراد داؤدؑ کی وہ مترنم اور پُر تاثیر آواز ہے جس میں وہ زبور پڑھا کرتے تھے۔ جس کو سننے کے لیے انسانوں کے علاوہ جانور اور پرندے بھی جمع ہو جاتے تھے۔
پیراہن یوسف سے مراد یوسفؑ کی وہ قمیض ہے جو یوسفؑ نے مصر سے اپنے باپ یعقوبؑ کے لیے کنعان بھیجی تھی اس قمیض کی خوشبو سے یعقوبؑ نے بے ساختہ کہا تھا کہ میرے بیٹے یوسفؑ کی قمیض ہے جسے آنکھوں سے لگا کر ان کی بینائی واپس آگئی تھی۔

iv. درج بالا اشعار کا مرکزی خیال لکھیں۔

جواب: شاعر مناظر صبح کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صبح کا منظر اس قدر دلکش اور دلنشین ہوتا ہے کہ اس کا براہِ راست اثر انسانی روح پر مرتب ہوتا ہے۔ صبح صادق کے وقت ہر ذی روح اللہ تعالیٰ کے نور سے منور ہوتا ہے ہر طرف حسن اور رنگینی دیکھ کر ہر کوئی عاشق بن جاتا ہے۔ انسانی فطرت کے مطابق ہر منظر سادہ اور قدرتی ہوتا ہے۔ مشرق سے اُبھرا ہوا سنہرا اُفق سورج کی روشنی سے لبریز ہوتا ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ میں لحن داؤد کی تاثیر پائی جاتی ہے اور بادِ صبا میں یوسفؑ کی قمیض کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔

یا

دھرتی کچھ بھی نہ بولی میرے دل کی صورت ڈول گئی — اپنی مجبوری سے پریم کے بھید مجھ پر کھول گئی
پریم کا بھید کھلا تو بادل چھٹ کے دُور ہوئے، بھاگے — چاند نے اپنا روپ دکھایا ننھے تارے بھی جاگے
چاند کا نور بھی اب تو مگر مجھ کو گیسُو کی سیاہی ہے — آج ہوئے سپنے میں درشن، آج تو میری تباہی ہے

سوالات:

i. شاعر نے دھرتی کو کس کی صورت کہا ہے؟

جواب: شاعر نے دھرتی کو اپنے دل کی صورت کہا ہے۔ جس طرح شاعر کا دل محبوب کی محبت میں ڈولتا ہے ایسے ہی دھرتی پیار و محبت میں ڈول رہی ہے۔

ii. ننھے تاروں کے جاگنے کا سبب کیا ہے؟

جواب: ننھے تاروں کے جاگنے کا سبب بادلوں کا چھٹ جانا اور چاند کا بھرپور طریقے سے اپنا روپ دکھانا ہے۔ جب چاند جوبن پر ہوتا ہے تو تارے بھی جاگ جاتے ہیں۔

iii. شاعر کی تباہی کی وجہ کیا ہے؟

جواب: شاعر کی تباہی کی وجہ سپنے میں محبوب کے درشن کرنا ہے۔ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ چاند کا نور بھی بے معنی ہے وہ بھی اسے محبوب کے گیسو کی سیاہی کے مانند دکھائی دیتا ہے۔

iv. اشعار میں موجود علمِ بیان کی اصطلاحات کی نشاندہی کریں۔

جواب: دھرتی کا دل کی صورت ڈولنا (تشبیہ)

چاند (محبوب کے لیے استعارہ و کنایہ)

چاند کا نور محبوب کے گیسو کی سیاہی کی مانند (تشبیہ)

(ج) حصہ غزل:

درج ذیل اشعار کو پڑھ کر آخر میں دیے گئے سوالات میں سے کوئی سے دو سوالات کے جوابات لکھیں: **(2x3=6)**

i. نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا نہ روش وہ ابرِ بہار کی — جس ادا سے یار تھے آشنا، وہ مزاج بادِ صبا گیا

ii. اب تیرے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح — سایۂ ابر کی مانند میں گزر جاؤں گا

iii. پوچھ لیتے کبھی تیرا بھی ارادہ تجھ سے — ہم نے چاہا تو کئی بار تھا، ہمت نہیں کی

سوالات:

i. یار بادِ صبا کے کس مزاج سے آشنا تھے؟

جواب: یار فصل بہار کے رنگ اور ابرِ بہار کی روش سے آشنا تھے۔

ii. شاعر شہر محبوب میں کس طرح آئے گا؟ اور قواعد کی رو سے یہ شعر کس کی مثال ہے؟

جواب: شاعر اپنے محبوب کے شہر میں مسافر کی طرح آئے گا اور "مسافر کی طرح" علم بیان کی رو سے تشبیہ ہے۔

iii. شاعر نے کئی بار کیا چاہا؟

جواب: شاعر نے کئی بار چاہا کہ محبوب سے اس کا ارادہ دریافت کر لیا جائے لیکن اپنی کم ہمتی کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے۔

(د) حصہ قواعد:

کوئی سے دو سوالوں کے جوابات لکھیں: **(2 x3=6)**

i. "لینا، اُٹھنا، دینا" امدادی افعال سے جملے بنائیں۔

جواب: لینا: محسن نے گاڑی خرید لی۔

اُٹھنا: فقیر بھری محفل میں چلا اُٹھا۔

دینا: احمد نے اپنی گاڑی بیچ دی۔

ii. مثال دے کر صنعتِ تضاد کی وضاحت کریں۔

جواب: ے رُخ و زلف پر جان کھویا کیا — اندھیرے اجالے میں رویا کیا

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں اندھیرے اور اجالے صنعت تضاد کا استعمال کیا گیا ہے۔

صنعتِ تضاد: تضاد کے معنی ضد یا الٹ ہونا کے ہیں۔ جب شعر و نثر میں دو یا دو سے زائد متضاد الفاظ استعمال کیے جائیں اسے صنعت تضاد کہا جاتا ہے۔ مثلاً زمین اور آسمان، اندھیرا اور اجالا وغیرہ

iii. درج ذیل جملوں کو قواعد کی رو سے پہچانیے:

۱۔ وہ کل آیا تھا اور آج چلا گیا ۔ ۲۔ مجھے اس کی بات کا یقین ہے کیونکہ وہ سچا ہے۔

۳۔ وہ وعدے تو کرتا ہے لیکن یاد نہیں رکھتا۔

جواب: ۱۔ وہ کل آیا تھا اور آج چلا گیا ۔ استدرا کی جملہ

۲۔ مجھے اس کی بات کا یقین ہے کیونکہ وہ سچا ہے۔ سببی جملہ

۳۔ وہ وعدے تو کرتا ہے لیکن یاد نہیں رکھتا۔ استدرا کی جملہ

حصہ سوم (کل نمبر 44)

سوال نمبر 3: درج ذیل میں سے کسی ایک پیراگراف کی تشریح کریں: (6)

الف۔ تپسیا اور عبادت کے طریقے اس زمانہ میں بھی ایسے ہی تھے جو کہ اب ہیں اور یہ بھی یونانیوں کے لیے ایک عجیب بات تھی۔ چناں چہ سکندر نے ایک امیر کو بھیجا کہ ان سے جا کر ملے۔ اور ان کے خیالات اور حالات معلوم کر کے کچھ حاصل کرے۔ اس نے شہر کے باہر جنگل میں کئی فقیر مختلف حالتوں

میں دیکھے کہ دھوپ میں تپ کر رہے ہیں۔ کوئی کھڑا ہے کوئی بیٹھا ہے مگر اس طرح کہ ذرا ہلتے جلتے نہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "کلیانا" تھا۔ وہ عمر میں نوجوان تھا اور جلتے پتھروں پر پڑا تھا۔ امیر مذکور نے اس کے پاس آ کر کچھ بات کی۔ کلیانا اس کی نئی وضع دیکھ کر اس طرح ہنسا کہ گویا اس کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا کہا تو یہ کہا کہ کپڑے پھاڑ کر ان جلتے پتھروں پر بیٹھ جاؤ اور اپنے تئیں فنا کرو، جب ہماری بات سمجھ میں آئے گی۔ اتنے میں ایک اور فقیر کہ سن رسیدہ تھا اور سب اس کی تعظیم کرتے تھے، وہ آیا اور اس نے آ کر کلیانا کو ملامت کی۔ اور اُن کے ساتھ نہایت اخلاق اور تواضع سے ملا۔

جواب: تشریح:

تشریح طلب پیراگراف میں مصنف کہتے ہیں کہ جب سکندر نے پے در پے فتوحات حاصل کیں تو 12 برس تک اقتدار میں رہے۔ اپنے عروج کے زمانے میں سکندرِ اعظم کی سلطنت مغرب میں یونان سے لے کر مشرق میں آج کے پاکستان، افغانستان، ایران، عراق اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ سکندرِ اعظم کا شمار تاریخ کے انتہائی متاثر کن اور ماہر رہنماؤں اور فوجی کمانڈروں میں کیا جاتا ہے۔ سکندر نے آدھی دنیا اپنے تصرف میں لے لی تو وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں عبادت کا طریقہ بڑا عجیب اور منفرد لگا۔

روحانی یا قلبی عبادت، ریاضت کے طریقے اس زمانے میں بھی ایسے ہی تھے جو کہ اب ہیں۔ یونانی مذہب کے معاملے میں دیوتاؤں اور مختلف معبودوں کی عبادت کرتے ہیں جس کے لیے سخت ریاضت کی جاتی تھی۔ چنانچہ سکندر بادشاہ نے ایک امیر مقرر کیا کہ وہ ان عبادت گزار یونانیوں سے جا کر ملے اور ان کے خیالات اور حالات و واقعات معلوم کر کے اصل حقیقت سے آگاہی حاصل کرے۔ امیر نے شہر کے باہر جنگل میں کئی فقیر مختلف بری حالتوں میں دیکھے جو دھوپ کی تپش میں خود کو تپا رہے تھے کوئی کھڑا ہے کوئی بیٹھا ہوا عبادت میں مشغول ہے وہ ذرا سا ہلنے کی بھی جسارت نہیں کرتے

؎ گردشِ دوران تو بہ توبہ ہم کو خدا بھی یاد نہیں ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"بے شک شرک بڑا ظلم ہے"۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ! ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے نہ وہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں۔ پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

سکندر کے بھیجے گئے امیر نے عبادت کرنے والے فقیروں میں ایک کا نام معلوم کیا جو کہ کلیانا تھا۔ وہ عمر میں نوجوان تھا اور عبادت کے نام پر جلتے ہوئے پتھروں پر پڑا ہوا تھا وہ سخت ریاضت اور کھلی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔ امیر نے کلیانا کے ساتھ مخاطب ہو کر کچھ بات کی۔ کلیانا نے امیر کی ظاہری حالت دیکھی تو اس پر خوب ہنسا جیسے وہ کوئی حقیقت نہیں جانتا تھا اس نے امیر سے کہا کپڑے پھاڑ کر ان تپتے ہوئے پتھروں پر بیٹھ جاؤ اور عبادت اور ریاضت میں خود کو فنا کر دو۔ تب تمہیں ہماری عبادت سمجھ آ جائے گی۔

؎ توحید دل میں ہو تو لبوں پر رہے خدا ہم یوں جیے تو کیا جیے بے دین، بے خدا

؎ دل اندھا، زبان اندھی، قلم اندھا، بیان اندھا اندھوں کو نظر آتا ہے سارا جہاں اندھا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہو گا؟ جو اللہ کے سوا ایسوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہ کر سکیں بلکہ ان کے پکارنے سے محض بے خبر ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ایک اور فقیر جو کہ عمر رسیدہ تھا وہ آیا سب اس کے آداب بجالائے تھے اس نے آ کر کلیانا کو امیر کے ساتھ بدتمیزی کرنے پر خوب برا بھلا کہا اور خود ان کے ساتھ بہت اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا اور عاجزی اور انکساری سے ملا۔

؎ مجھے عاجزی میں وہ مزہ ملا کہ جو غرور تھا وہ نکل گیا
تیرے کرم کی ایسی ہوا چلی کہ میں گرتے گرتے سنبھل گیا

ب۔ تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کر دیا، جو بیکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں، جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنا دی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے، آج ہم پر آسمان روتا ہے۔

جواب: تشریح:

تشریح طلب پیراگراف میں مصنف مغلیہ سلطنت کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بھی عہد یا سلطنت کا خاتمہ اچانک نہیں ہوتا، اس زوال کے پیچھے ہمیشہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی وجوہات ہوتی ہیں جنھیں بروقت پہچان کر ان کا حل نہ نکالا جائے تو یہ مسائل دیمک کی طرح اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں سلطنت مغلیہ زمین بوس ہوئی اور ذلت و رسوائی اس کا مقدر بنی۔ انگریزوں کی چالوں کو سارا الزام دینا حقیقت سے آنکھیں چرانا ہے۔ اپنی نالائقیوں اور نااہلیوں سے دوسروں کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت اپنی بے عملی کے باعث زوال پذیر ہو گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ہم جب کسی چیز (کے پیدا ہونے) کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمارا کہنا بس اتنا ہوتا ہے کہ ہو جا، بس وہ ہو جاتی ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ قسمت ان کی زندگی میں در در کی ٹھوکریں، مصائب اور تکالیف لکھ دیتی ہے جو اپنے ہاتھ آئی بادشاہت، منصب و عہدے کو ٹھوکریں مارتے ہیں یعنی پاؤں میں روند ڈالتے ہیں

؎ پھر گردشِ تقدیر پہ رونا آیا　　دل کی بگڑی ہوئی تصویر پہ رونا آیا

تقدیر نے مغلیہ سلطنت کو مجبوراً اور لاچار کر دیا جو بے بس لوگوں کے کام آتے تھے۔

؎ وہ مالک ہے جہاں بھر کی وہی قسمت بناتا ہے　　نصیبوں میں لکھے جس کے اسے در پر بلاتا ہے

مصنف کہتے ہیں کہ ہم چنگیز خان کی نسل ہیں جس کی دہشت سے ہر کوئی لرز جاتا تھا۔ وہ منگول سلطنت کا بانی تھا اس کا اصل نام "تموجن" تھا جس کا مطلب "فولاد جیسا مضبوط" ہے۔ وہ دنیا کی تاریخ کا ایک منفی کردار تھا جس نے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ وہ ظالم و جابر جنگجو تھا جس کی تلوار سے زمین کانپ اٹھتی تھی۔ ہمارا تعلق تیمور کے خاندان سے ہے کیونکہ ہم اس کی اولاد ہیں۔ اس کا تعلق سمرقند سے تھا وہ ایک ہاتھ میں تلوار اٹھاتا اور دوسرے میں کلہاڑا رکھتا تھا۔ اس نے اصفہان، شیراز، بغداد، ایران و عراق پر قبضہ کیا۔ لہٰذا ہم تیمور کے خاندان سے ہیں۔ ہم بادشاہ شاہجہاں کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جواہرات کی بہار دکھادی۔ یعنی اپنی محبوب بیوی کے لیے آگرہ میں مقبرہ (تاج محل) بنوایا جو سنگِ مرمر سے بنی ہوئی عظیم الشان عمارت ہے۔ اس کے علاوہ جامع مسجد دہلی بنوائی۔

؎ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

مصنف فخریہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے بادشاہ ظہیر الدین بابر کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم عزت و ناموس کا پیکر تھے ہمارا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ لوگ ہماری دہشت سے لرز اٹھتے تھے لیکن آج ہم پر یہی زمین تنگ پڑ گئی ہے۔ ہمیں کوئی پناہ گاہ میسّر نہیں آتی۔ آخر یہ زمین کیوں بغاوت پر اتر آئی ہے۔ آج ہم پر مشکلات و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ آج آسمان بھی افسوس کا اظہار کر رہا ہے۔ کیونکہ ہم اپنا تخت و تاج، منصب و مقام ہر چیز سے محروم ہو گئے ہیں۔ انسان مصائب و آلام کے گھن گرج کو تنکے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ناکامیوں کو کامیابی میں بدلنے کا جذبہ و حوصلہ اس کے اندر موجزن رہتا ہے۔ وہ قدرت کو نہیں کوستا بلکہ اپنی غلطی کا احساس کر کے اسے سدھارنے کی کوشش کرتا ہے۔

؎ نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا　　مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

جو قومیں جفاکشی، علم و عمل اور اقدار چھوڑ کر عیش و عشرت اور آرام طلبی کی دلدادہ ہو جاتی ہیں ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔

سوال نمبر 4: درج ذیل میں سے کسی ایک نظمیہ جزو کی آسان لفظوں میں تشریح کریں۔ (6)

الف۔ مدد کرنی ہو اس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں
بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو
کسی کو یاد رکھنا ہو کسی کو بھول جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں

جواب: تشریح:

تشریح طلب بند میں شاعر کہتا ہے کہ میں اپنی اس عادت کی وجہ سے کسی کے برے وقت میں اس کے کام نہ آ سکا۔ اسی طرح اگر مدتوں بعد پرانے تعلقات دوبارہ سے استوار کرنے ہوں یا بہت پرانے جانے پہچانے رستوں پر کسی پرانے دوست سے ملنے جانا ہو اس میں بھی مجھ سے تاخیر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تب مجھے یہی خیال آتا ہے کاش! یہ کام میں بہت پہلے کر لیتا۔

ے سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

شاعر مزید یہ کہتا ہے کہ کوئی موسم بدل رہا ہو یعنی گرمی سردی میں بدل رہی ہو یا بہار خزاں میں تو نئے موسم سے دل لگانے میں مجھ سے تاخیر ہو جاتی ہے اور جب میں دل لگانے لگتا ہوں تب موسم گزر چکا ہوتا ہے۔ بدلتے موسموں سے مراد بدلتے حالات بھی لیا جا سکتا ہے۔ انسان بدلتے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں دیر لگا دیتا ہے۔ ماضی کے جھروکوں میں کھو جاتا ہے اور ادھر وقت ہی گزر جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کسی خوشگوار اور دل کش واقعے، شخص کو دل میں رکھنا ہو یا کسی تلخ یا کڑوی بات، واقعے، کسی بے وفا شخص کو دل سے نکالنا ہو، کسی برے حادثے کو بھلانا ہو اس میں بھی مجھے دیر ہو جاتی ہے۔ میں کوئی کام بھی وقت پر نہیں کر پاتا ہوں۔ دیر کے موضوع پر داغؔ دہلوی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

ے نہ جان کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ب۔ بادلو! ڈھنڈ کی مانند بکھرنا سیکھو اِک رِدا بن کے بکھر جاؤ مری دنیا پر
اپنے دامن میں چھپا لو میرے سب بچوں کو یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، زر و سیم کا بار یوں بکھر جاؤ کہ اِک دل کو بھی محسوس نہ ہو

جواب: تشریح:

اس بند میں بادل بطور (بزرگوں کا) سایہ استعمال ہو رہا ہے۔ جس طرح گھر کے بزرگ گھنے سایے کی طرح سب کی حفاظت کرتے ہیں ہر اچھے برے وقت میں ساتھ دیتے ہیں بادلوں کی مانند ہر وقت سر پر موجود ہوتے ہیں اسی طرح اس نظم میں شاعر بادلوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم کسی ایک جگہ سایہ نہ دو بلکہ جس طرح دھند ہر طرف پھیل جاتی ہے اسی طرح تم بھی پھیل جاؤ اور دنیا میں دکھ درد، تکلیف، مصائب کے وقت میں سب کے سر پر گھنے سایے کی مانند چھا جاؤ اور اپنے سائے کے دامن میں سب کو پناہ دے دو۔ ہر طرف بھوک، مفلسی، خود غرضی، ظلمت، ناانصافی، قتل و غارت، خوف کی گہری دھوپ ہے۔ بچوں سے مراد شاعر کی ہر قسم کے لوگ ہیں (ہر خاص و عام، ادنیٰ و اعلیٰ)۔ اس گہری دھوپ سے بچانے کے لیے تمام لوگوں کے سر پر گھنے سایے کی مانند چھا جاؤ تاکہ ان کو خوشی اور اپنائیت کا احساس ہو گو کہ یہ لوگ اتنے معصوم ہیں کہ روتے بلکتے، تلخ حالات کا سامنا کرتے ہیں لیکن وہ بھی ہنستے ہوئے کرتے ہیں۔ یہ ان کے معصوم ہونے کی نشانی ہے۔ وہ معمولی اور کم قیمت اشیا کی قدر دانی بھی جانتے ہیں جن کو خوش ہونے کے لیے بڑی وجہ کی ضرورت نہیں معمولی چیزیں بھی ان کے اندر سکون اور خوشی کے لمحات چھوڑ جاتی ہیں۔ شاعر بادلوں کو کہتا ہے کہ ان کے سر پر اچھے موسم کی شکل میں یوں بکھر جاؤ اس قدر سکون بخش سایہ مہیا کرو کہ وہ سونے اور چاندی یعنی قیمتی چیزوں کے نہ ہونے کا بوجھ محسوس نہ کریں۔

ے تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا زندگی دھوپ تم گھنا سایہ

بادلوں کی علامت کو اس طرح بھی لیا جا سکتا ہے کہ بادل اوپر سے اس زندگی، دنیا کے سارے دکھ درد نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ محسوس بھی کرتے ہیں۔ اور بارش کو صورت برستے بھی ہیں۔

سوال نمبر5: درج ذیل میں سے کسی ایک غزلیہ جزو کی تشریح کیجیے: (3+3+3=9)

الف۔ بکنے والوں میں جہاں، ایک سے ایک آگے ہو ایسے میلے میں، خریدار کو کیا بولنا ہے
لَو چلے آئے عدالت میں گواہی دینے مجھ کو معلوم ہے، کس یار نے، کیا بولنا ہے
اور کچھ دیر رہے گوش بر آواز ہَوا پھر چراغ سرِ دیوار کو کیا بولنا ہے

جواب: تشریح:

تشریح طلب اشعار میں شاعر ایسے ضمیر فروشوں اور غداروں کے بارے میں بات کر رہا ہے کہ جو قومی مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور چند پیسوں کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کر دیتے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک بکنے کے لیے تیار بیٹھا ہو تو وہاں خریدار کو اونچی آواز میں بولی لگانے کے لیے بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ ہی قیمت کے تعین میں زیادہ بحث و تکرار کرنا پڑتی ہے۔

ے ہم نے دیکھا ہے دولت کے حسین شانوں پر لوگ بڑے آرام سے غیرت کو سلا دیتے ہیں

دوسرے شعر میں شاعر معاشرتی منافقت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بعض لوگ بظاہر تو ہمارے دوست ہوتے ہیں لیکن در پردہ وہ ہمارے مخالف ہوتے ہیں آستین کے سانپ کی مانند جب انھیں موقع ملتا ہے وہ گزند پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔ شاعر کہتا ہے کہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں ظالم حکمرانوں نے مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا جب مجھے عدالت میں پیش کیا گیا اور میرے خلاف گواہی دینے کے لیے جن کو بلایا گیا ان میں

پرانے دوست بھی شامل تھے جو کبھی بظاہر میرے ساتھ ہوتے تھے لیکن اپنی منافقت اور بے ضمیری کی وجہ سے آج وہ میرے خلاف گواہی دینے چلے آئے ہیں:

؎ دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

تیسرے شعر میں شاعر نے چراغ کا استعارہ اپنی ذات کے لیے استعمال کیا ہے جس طرح چراغ روشن ہو کر رات کی تاریکی کا پردہ چاک کرتا ہے اور اندھیرے کو اجالے میں بدل دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر کی ذات اور اس کی زندگی بھی چراغ کی مانند زمانے کی تاریکی کو روشنی سے بدل رہی ہے۔ شاعر کی روشن خیالی اور اس کی تعلیمات جہالت کے لیے نور کا چراغ ہیں۔ مایوس اور مردہ دلوں کے لیے امید اور زندگی کا پیغام ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ میں بجھنے والا ہوں لیکن جب تک جلتا رہوں گا روشنی پھیلاتا رہوں گا۔ ابھی ہوا کو میرے بجھنے کی آواز کا انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک میں بجھ نہیں جاتا میں اسی طرح روشنی پھیلاتا اور تاریکی کا پردہ چاک کرتا رہوں گا۔

؎ ہر حال میں حق بات کا اظہار کریں گے منبر نہیں ہو گا تو سر دار کریں گے

ب۔ سینے میں بے قرار ہیں مردہ محبتیں ممکن ہے یہ چراغ کبھی خود ہی جل پڑے
اے دل تجھے بدلتی ہوئی رُت سے کیا ملا پودوں میں پھول اور درختوں میں پھل پڑے
اب کس کے انتظار میں جاگیں تمام شب وہ ساتھ ہو تو نیند میں کیسے خلل پڑے

جواب: تشریح:

ان اشعار میں شاعر اپنی محبت کا نوحہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے سینے کے اندر بے قرار اور بے چین محبتیں انتظار کی حد پار کرتے ہوئے مردہ ہوتی جا رہی ہیں۔ مردہ ہونا علامت ہے مایوسی کی یعنی ایک مصرع میں شاعر مایوسی کا اظہار کر رہا ہے اور دوسرے مصرعے میں خود ہی اپنے آپ کو ڈھارس دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ امید کے چراغ کبھی خود ہی جلنے لگ جائیں۔ ان میں چھپی ہوئی کوئی چنگاری انھیں پھر سے بھڑکا دے۔

دوسرے شعر میں شاعر اپنے دل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ بدلتے موسموں میں تجھے کیا ملا اے دل! کہ تو بھی بدلتے موسموں کی مانند بدل گیا خود سے امید باندھنے لگا جب کہ موسم کے بدلنے سے تمہاری حالت میں تو کوئی فرق نہ آیا تم تو ویسے ہی اجاڑ اور ویران رہے جب کہ پودوں میں پھول اور درختوں میں پھل لگ گئے یعنی ہر شے سرسبز ہو گئی، اس کو فائدہ حاصل ہوا، ان کی امیدیں بر آئیں لیکن اے دل تم نامراد ہی رہے۔

آخری شعر میں شاعر اپنی تنہائی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب میرا محبوب میرے ساتھ یاد بن کر تھا تو میں ساری رات اس کے انتظار میں کاٹ لیتا تھا۔ انتظار تکلیف دہ ضرور ہوتا ہے لیکن وصل کی خواہش اس کو بیدار اور متحرک رکھتی ہے لیکن جب سے یہ انتظار ختم ہوا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے بہار آ گئی ہو وہ اب میرے ساتھ ہے تو میری نیند میں خلل یعنی رکاوٹ بھی نہیں آتی میں ایسی سکون کی نیند سوتا ہوں کہ جیسے وہ انتظار کا عالم بالکل بھول چکا ہوں۔

؎ شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

سوال نمبر 6: پرنسپل کے نام کریکٹر سرٹیفکیٹ کے حصول کے لیے درخواست لکھیں۔ (8)

جواب: بخدمت جناب پرنسپل صاحب، اسلام ماڈل کالج فار بوائز، اسلام آباد

عنوان: درخواست برائے حصول کریکٹر سرٹیفکیٹ

جناب عالی!

مؤدبانہ گزارش ہے کہ میں تعلیمی سیشن 2021-2022 میں آپ کے کالج کا ایف ایس سی کلاس کا باقاعدہ طالب علم رہا ہوں اور انٹر میڈیٹ کے سالانہ امتحان میں رولنمبر 500654 کے تحت شرکت کی اب میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے درخواست دینی ہے جس کے لیے کالج کی طرف سے جاری کردہ کریکٹر سرٹیفکیٹ کا نقل منسلک کرنا بھی لازمی ہے۔

میں نے دورانِ تعلیم ہمیشہ کالج کے نظم وضبط کی پابندی کی ہے اور ہمیشہ اپنے اساتذہ کا صمیم قلب سے احترام کیا ہے۔ میں کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا ہوں۔ آپ سے استدعا ہے کہ مجھے کریکٹر سرٹیفکیٹ جاری فرمایا جائے۔ آپ کی عین نوازش ہو گی۔

درخواست گزار

بتاریخ: ۱۵ اپریل ۲۰۲۲ ا۔ب۔ج۔د

سوال نمبر7: کسی ایک عنوان پر پانچ سو سے چھ سو الفاظ پر مشتمل مضمون تحریر کریں۔ (15)

الف: میرا پسندیدہ غزل گو شاعر ب: ہمارا تعلیمی نظام

ج: پاکستان کا قیام ناگزیر تھا د: معاشرے پر سوشل میڈیا کے اثرات

جواب: مضمون:

الف: میرا پسندیدہ غزل گو شاعر

؎ اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

کون جانتا تھا کہ 9 نومبر 1877ء کو شیخ نور محمد کے ہاں جنم لینے والا بچہ ایک دن عظیم لیڈر اور شاعر ہو گا۔ آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ آپ کے والدین نہایت شریف، صوفی اور دیندار تھے اور ان کی تربیت کا اثر آپ پر بھی نہایت اچھے اثرات کا حامل ثابت ہوا۔

عام مسلمانوں کی طرح شیخ نور محمد نے بھی اپنے ہونہار بیٹے کو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک دینی مدرسے میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل کروادیا۔ پانچ سال کی عمر میں مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخلہ لیا جہاں آپ نے پرائمری اور میٹرک میں وظائف حاصل کیے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ نے مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے ایف اے پاس کیا۔

سیالکوٹ میں ہی آپ کو مولوی میر حسن جیسے شفیق اور لائق استاد مل گئے جن کے فیض سے آپ کو عربی، فارسی اور اسلامیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب علامہ اقبال کے مشورے پر ہی ملا تھا۔ سیالکوٹ سے ایف اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور یہیں فلسفے میں ایم اے کیا۔ یہاں آپ کو پروفیسر آرنلڈ جیسے لائق استاد سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ پروفیسر آرنلڈ اقبال کے بارے میں کہتے ہیں کہ "اقبال جیسا شاگرد، استاد کو محقق اور محقق تر بناتا ہے۔ مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کچھ عرصہ اورینٹیل کالج اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے۔ اقبال میں علمی تحقیق کا جذبہ اوائل عمری میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسی ذوق و تجسس کی انگلی تھام کر آپ 1905ء میں یورپ روانہ ہو گئے۔ انگلستان سے بیرسٹری اور جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یورپ کے اسی سفر نے آپ کے دل میں اسلام کے ضابطہ حیات کی صداقت کو مزید پختہ کر دیا اور جب آپ نے مغربی عقائد، رسوم و رواج کا موازنہ اسلامی تہذیب سے کیا تو آپ پر واضح ہو گیا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد جھوٹ اور تصنع کی کھوکھلی مٹی پر رکھی گئی ہے۔ رسولؐ خدا سے سچا عشق ہی وہ تجربہ گاہ تھا، جس نے مغربی افکار کو پرکھا اور پھر فرمایا!

؎ خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

وطن واپسی پر لاہور میں کچھ عرصہ وکالت کی۔ شاعری پر خاص توجہ دی۔ آغاز میں آپ نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں اپنی نظمیں پیش کیں جنہوں نے آپ کو عظیم شاعر کے طور پر متعارف کروایا۔ 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ الہ آباد میں اپنے خطبے کے دوران پہلی مرتبہ اسلامیان ہند کے لیے ایک آزاد اور علیحدہ مملکت کا نظریہ پیش کیا۔ اسی نظریے کی وجہ سے آپ کو مفکر پاکستان کہا جاتا ہے۔

آپ نے مسلمان قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اپنی شاعری کو استعمال کیا، حصول آزادی اور قیام پاکستان کے لیے تیار کیا۔

آپ نے نہ صرف تصور پاکستان پیش کیا بلکہ اس سلسلے میں پاکستان کے بانی کو نہایت مفید مشورے بھی دیتے رہے۔ قائدِ اعظم نے ایک دفعہ تحریک پاکستان کے دوران فرمایا کہ "اگر ہم مسلمانوں کے لیے الگ ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک طرف مجھے اس ملک کی صدارت پیش کی جائے اور دوسری طرف علامہ اقبال کی تصانیف تو میں اقبال کی تصانیف کو منتخب کر لوں گا۔"

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ اقبال دوران تعلیم ہی ادبی محافل میں شریک ہونے لگ گئے تھے۔ ایک موقع پر جب آپ غزل کے اس شعر پر پہنچے:

؎ موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے! قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی بے اختیار چلا اٹھے "میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر۔" اسی زمانے میں داغ، میر، حالی اور اکبر کی شاعری کا چرچہ تھا۔ آپ نے نظر انتخاب داغ پر پڑی تو اصلاح لینے لگے۔ "مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخن داں کا"

شیخ عبد القادر کے ایما پر مشہور ادبی رسالہ "مخزن" کے لیے ہمالہ، ایک آرزو، ترانہ ہندی اور تصویر درد جیسی شاہکار نظمیں لکھیں اور وطنی و قومی شاعری کا آغاز کیا۔ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور 1905 تا 1908ء تک کا ہے۔ آپ امن و آسائش کو چھوڑ کر ہنگامہ آرائیوں کے دلدادہ ہو گئے۔ مغرب کے لیے تنبیہ اور محکوموں کے لیے مسیحا بن گئے۔ اس دور کی شاعری ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے۔ اس میں غم والم اور سوز و گداز ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ دنیا کے تمام نظام ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے اور صرف اسلامی نظام ہی دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

1908ء کے بعد کا زمانہ اقبال کا تیسرا دور ہے۔ اس دور میں شاعر پیغامبر بن جاتا ہے۔ یاس، امید سے بدل گئی ہے۔ شکوک پر یقین نے غلبہ پالیا ہے۔ اور شاعری نے ساحری کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ خودی اور زندہ دلی کے نغمے گائے جانے لگے۔ پختہ خیالات پاکیزہ طرز بیان دلکش پیرایہ، شگفتہ تراکیب اور چست بندشیں کلام میں جذبہ جوش و درد اور سوز و ترنم پیدا کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں:

؎ تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

مگر پھر یک لخت آپ کا انداز تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر کہتے ہیں:

؎ عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ توٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

طلاعِ اسلام، شمع و شاعر جیسی نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ بال جبرائیل کی غزلوں میں شان تغزل پورے عروج پر ہے۔ زیادہ تر توجہ فارسی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

؎ یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم　　جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس وقت اقبال نے محسوس کیا کہ اسلامی دنیا کی حالت بڑی یاس انگیز ہے۔ علم و حکمت کا سرچشمہ تیزی سے خشک ہو رہا ہے اور مغربی تہذیب و تمدن کی رو روز بروز بڑھتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے گو سفندان قدیم کی تباہ کن تعلیمات کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا اور اسلام کا عالمگیر پیغام ملت اسلامیہ اقوام مشرق اور تمام دنیا کو بتا دیا۔ اقبال نے یاس و قنوط کی زنجیروں کو توڑ کر خود اعتمادی کا جذبہ بیدار کیا اور کاروان ملت کو "نیز فرک گامزن" کا نعرہ مستانہ لگا کر عظمت پر رواں دواں کر دیا۔

آپ کا کلام، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے۔ بانگِ درا، بال جبرئیل اور ضرب کلیم اردو کے مجموعے ہیں۔ ارمغان حجاز کا کچھ حصہ اردو میں ہے اور کچھ فارسی میں۔ پیغام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، اسرار خودی، رموز بے خودی وغیرہ فارسی میں ہیں۔ پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور باقی تصانیف کا بھی دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال 21 اپریل 1938ء کو اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپ کا مزار بادشاہی مسجد کے صدر دروازے کے باہر ہے۔ جہاں ہر کس و ناکس عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہے اور ارد گرد کی فضا آپ کے اشعار کی روشنی میں مہکتی رہتی ہے۔

؎ آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے　　سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ب: ہمارا تعلیمی نظام

موجودہ نظام تعلیم ہمیں انگریزوں سے ورثے میں ملا تھا اور قدرتی طور پر یہ انگریزوں کے حکومتی مقاصد پورے کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ تعلیم کا فروغ، کسی ملک اور قوم میں ذہنی بیداری، بالغ نظری اور فہم و شعور کی ترقی کا باعث ہوتا ہے، اس لیے قدرتی طور پر انگریزوں کو اس ملک میں بامقصد تعلیم کے فروغ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ برطانوی قبضے سے پہلے ہندوستان میں جو صحت مند اور ترقی پذیر نظام تعلیم تھا۔ انگریزوں نے اسے بھی ختم کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک تو ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو ان کے مذہب، روایات اور اقدار سے بے گانہ کر کے انھیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیا جائے اور دوسری طرف نئی تعلیم کے ذریعے کلرکوں کا ایک گروہ تیار کیا جائے جو ہندوستان میں برطانوی انتظامیہ کے کل پرزوں کے طور پر انگریزوں کی خدمت کر سکے۔ بقول علامہ اقبال:

؎ اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ انگریز اس سازش میں کامیاب ہوا۔ انگریزی تعلیم کے برے اثرات اپنا رنگ دکھانے لگے اور تعلیم بدل جانے سے دل بھی بدل گئے۔ مسلمان زعما پر جلد ہی جدید تعلیم کی حقیقت کھل گئی۔ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا مگر بدقسمتی سے آزادی کے بعد بھی ہماری غلامانہ ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور اسلامی مقاصد اور ضروریات کی طرف ہم نے کوئی توجہ نہیں دی۔ نظام تعلیم کے مقاصد کا تعین کیا گیا اور نہ کسی کو اس میں بنیادی تبدیلی کا خیال آیا۔ کئی بار تعلیم کمیشن قائم ہوئے، تعلیم سفارشات مرتب ہوئیں، نصابات میں تبدیلیاں کی گئیں مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ البتہ یہ تبدیلی ضرور ہوئی ہے کہ "اسلامیات" کو بطور ایک لازمی مضمون کے پڑھایا جانے لگا ہے۔ مگر ایک ایسے نظام تعلیم میں جس کی بنیاد فرنگیوں نے رکھی اور جس کے مقاصد سراسر حاکمانہ اور خود غرضانہ استبدادی تھے، اسلامیات یا مذہب کی تعلیم، ٹاٹ کے لباس میں مخمل کے پیوند کے مترادف ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بقول:

؎ نئی تعلیم میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے　　مگر یوں ہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

اس مذہبی یا اسلامیات کی تعلیم سے کوئی خاطر خواہ اور مثبت نتیجہ نہیں نکل سکا اور پاکستان کی موجودہ صورت حال اس کا واضح ثبوت مشرقی پاکستان ہم سے کیوں الگ ہوا؟ اس لیے کہ ہمارے نظام تعلیم میں ایک اسلامی ملک کے اساسی تقاضوں کو پورا کرنے کا کوئی متبادل موجود نہیں تھا۔ ایک نظریاتی قوم کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہمارا نظام تعلیم بانجھ ثابت ہوا ہے۔ یہ نہ تو ہمارے نظریاتی، اسلامی اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور نہ مادی اور دنیاوی اعتبار سے ہمارے لیے فائدہ مند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہر طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی کثرت نظر آتی ہے۔ مرحوم اکبر الٰہ آبادی نے اپنی خداداد بصیرت اور دور اندیشی کی بدولت جدید تعلیم کے مضمرات کا اندازہ لگالیا تھا۔ کہتے ہیں:

مسجدیں سنسان ہیں اور کالجوں میں دھوم ہے　　مسئلہ قومی ترقی کا مجھے معلوم ہے
یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

موجودہ ملکی صورتِ حال، نظام تعلیم میں فوری تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہمارے تعلیمی مسائل کیا ہیں تاکہ ان مسائل کے حل کے لیے مناسب تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں۔ ہمارے اہم تعلیم مسائل یہ ہیں:

"ہمارا نظام تعلیم بے مقصد ہے۔ پہلے تو یہ بات طے ہو جانی چاہیے کہ اس تعلیم کا مقصد اچھے انسان، اچھے مسلمان اور اچھے پاکستانی تیار کرنا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیمی نظام کو اسلام کی اساس پر استوار کیا جائے تاکہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان کے ذہن پر اسلام کی حقانیت اور ملی وحدت کا نقش جم جائے۔ وہ کسی کی ذہنی غلامی یا مرعوبیت میں مبتلا نہ ہو سکے بلکہ فخر کے ساتھ اپنے مسلمان ہونے کا اظہار و اعلان کر سکے۔ اس کے لیے قرآن و حدیث اور دین کی لازمی تعلیم کے ساتھ دیگر علوم و فنون کو بھی اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ترتیب دے کر پڑھایا جائے تاکہ طالب علم صرف پڑھنا لکھنا ہی نہ سیکھیں بلکہ کردار کے اعتبار سے بھی مثالی مسلمان ہونے کا نمونہ پیش کر سکیں۔

تعلیم کے شعبے میں باقاعدہ منصوبہ بندی کی بڑی کمی ہے۔ ماہرین تعلیم کو ایک جامع منصوبہ تیار کر کے یہ طے کرنا چاہیے کہ میڈیکل، انجینئرنگ، کامرس، کمپیوٹر، انتظامات اور دیگر مختلف علوم و فنون اور شعبوں میں کتنے طلبہ کو تعلیم دینی ہے۔ یہ منصوبہ ملک کی حقیقی ضروریات کے مطابق تیار کیا جائے اور اسی اعتبار سے ملک میں تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔

طلبہ پر اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا نقش بہت گہرا ہوتا ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں ان معماران قوم کی اسلامی اور اخلاقی تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

ہمارے ملک میں تعلیم کے دو الگ متوازی نظام چل رہے ہیں۔ ایک عام تعلیمی ادارے، دوسرے انگریزی اور غیر ملکی طرز کے سکول کالج، جہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے، بلکہ بعض اداروں میں تو اردو بولنا بھی ممنوع ہے۔ موخر الذکر طرز کے ادارے اپنے مزاج، ماحول، انداز تربیت، نصابات تعلیم، طرزِ تدریس وغیرہ کے اعتبار سے سراسر اجنبی اور "غیر ملکی" ہیں۔ بہت سے ادارے کئی برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں سے منسلک ہیں۔ وہ نہ صرف ملی تقاضوں کو پورا نہیں کرتے بلکہ ان کے نصابات، طرزِ تدریس، ماحول اور بچوں کی تربیت کا انداز سراسر قومی اور ملی مفادات کے خلاف ہے۔ بعض غیر ملکی ادارے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں میں نقب لگاتے ہیں۔ بعض غیر ملکی ایجنٹوں کا سا کردار ادا کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی سختی سے نگرانی کی جائے۔ پورا نظام تعلیم یکساں ہونا چاہیے۔ قوم اور ملت ایک ہے تو پھر تعلیم کے دو یا تین نظام کیوں؟ ہمارے تمام تعلیمی اداروں کے نظام، نصاب، اساتذہ اور انداز سب میں یکسانیت ہونی چاہیے۔

بلاشبہ ہمارا ملک غریب ہے اور تعلیم مہنگی ہے ہم اپنے بجٹ کا بہت تھوڑا حصہ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جاگیرداروں، بڑے زمینداروں اور کارخانہ داروں پر تعلیمی ٹیکس عائد کر کے جمع شدہ رقم کو تعلیم پر خرچ کیا جائے تاکہ تعلیم کا معیار اونچا ہو، تعلیم سستی ہو اور کوئی شخص محض وسائل کی کمی کے سبب تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ تعلیم میں تجارتی نقطۂ نظر کو ختم کیا جائے۔"

مندرجہ بالا تعلیمی مسائل حل کیے بغیر، تعلیمی نظام میں کوئی قابل ذکر تبدیلی ناممکن ہے۔ پاکستان کا مستقبل، کل کے معماروں یعنی طلبہ اور طالبات سے وابستہ ہے۔ ان کی ذہنی تربیت اور صلاحیتوں کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ کئی سال پہلے ممتاز قانون دان اور دانشور اے کے بروہی مرحوم نے کہا تھا "میرا ایمان ہے کہ پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور شان و شوکت کی جنگ، خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس کے سکولوں اور کالجوں میں لڑی جائے گی۔ اس کی لائبریریاں اور لیبارٹریاں ہی میدان جنگ بننے والی ہیں۔" افسوس ہے کہ اس جنگ میں ہمارا کردار قابل رشک نہیں رہا۔ ہم نے ملک کا آدھا حصہ (مشرقی پاکستان) ضائع کر دیا۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ہم اپنی آزادی کیوں نہ برقرار رکھ سکے؟ اس لیے کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود، ہم حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہیں۔ حقیقی آزادی کا اولین مرحلہ ذہنی اور فکری آزادی ہے اور ذہنی و فکری آزادی کا آفتاب ہمیشہ تعلیم گاہوں کے افق سے طلوع ہوتا ہے۔

جب تک کوئی قوم اغیار کے بنائے ہوئے نظام تعلیم سے نجات پا کر اپنے عقائد اور اپنی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام تعلیم مرتب و استوار نہیں کر لیتی، وہ سیاسی آزادی پا لینے کے باوجود، حقیقی آزادی سے بہرہ مند نہیں ہو سکتی۔ خدا کرے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں پیدا کر سکیں کہ ہمیں حقیقی آزادی حاصل ہو اور کوئی طاقت ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔

ج: پاکستان کا قیام ناگزیر تھا

؎ نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا بناء ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اسلام دینِ فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے پسندیدہ دین کا مذہب باطلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ دین کو دنیا کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں تزکیۂ نفس کی اہمیت ہے لیکن رہبانیت کی اجازت نہیں۔ مسلمان کفار سے الگ خصوصیت کے مالک ہیں اور اسلام کے آغاز سے اسلام دشمن قوتیں اس کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ مسلمانوں کا تشخص پہلے دن ہی سے غیر مسلموں کی آنکھ میں کھٹکتا ہے اور وہ اسے ختم کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہتے ہیں۔

؎ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

برصغیر پاک و ہند میں جو پہلا آدمی مسلمان ہوا وہ اپنے خیالات و نظریات اور گفتار و کردار کے لحاظ سے کفار سے مختلف تھا۔ مسلمان ہر لحاظ سے غیر مسلموں سے اپنا الگ تشخص رکھتے ہیں اور اسی انفرادیت کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ قائدِ اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلم لیگ نے اسی بنیاد پر ایک الگ ملک پاکستان کے قیام کی جدوجہد کی، جہاں مسلمان اپنے نظام حیات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ قائدِ اعظم نے تحریک پاکستان کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے اہل اسلام کے تشخص کے بارے میں فرمایا تھا کہ پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے، وطن اور نسل نہیں۔ پاکستان دنیا کی اولین نظریاتی مملکت ہے جس کی اساس دو قومی نظریہ یا نظریہ پاکستان ہے۔ مسلمانانِ ہند نے سرزمین ہند سے آزادی وطن اور احیائے اسلام کی تحریک جاری رکھی جس کی داغ بیل حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کے دین الٰہی سے بغاوت کر کے ڈال دی تھی۔ مسلمانوں کے ملی تشخص کی یہ تحریک مختلف مراحل طے کرتی تحریک پاکستان کی صورت میں آگے بڑھتی رہی، جس کا جذبہ محرک دو قومی نظریہ تھا۔

1857ء میں مسلمانانِ ہند نے آزادی کی تحریک شروع کی اور انگریزوں سے جنگ کی۔ مفتی کفایت علی کافیؔ، مفتی صدر الدین آزردہ، احمد اللہ مدراسی، علامہ فضلِ حق خیر آبادی اور جنرل بخت خاں جیسی کتنی ہی عظیم شخصیات نے جان و مال اور عزت و شہرت کی قربانی دی۔ بعض نے جامِ شہادت نوش کیا اور بعض نے کالے پانیوں کی سختیاں جھیلیں۔ جنگ آزادی میں مسلمانوں نے اپنی حکومت کی بحالی کی کوشش کی۔ جنگ ناکام ہوئی تو مسلمان انگریزوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو گئے۔ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا اور ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ایسے میں سر سید نے مسلمانوں کو سنبھالا۔ سر سید کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کو فی الحال سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ انہیں اپنی پوری توجہ حصول علم کی طرف مبذول کرنی چاہیے۔ سر سید نے 1875ء میں علی گڑھ میں ایم اے او ہائی سکول قائم کیا گیا جسے دو سال بعد کا درجہ دے دیا گیا۔ اس ادارے کے قیام سے مسلمانوں نے جدید علوم میں مہارت حاصل کی۔ اس ادارے نے تحریک پاکستان کے پرجوش رہنما اور کارکن پیدا کیے جن کی شب و روز محنت سے آزادی وطن کی منزل قریب تر آ گئی۔ سر سید پہلے پہل ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو خوبصورت دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دی۔ لیکن 1867ء میں ہندوؤں کے اردو اور فارسی زبان سے متعلق معاندانہ طرزِ عمل نے انہیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ ہندو اور مسلمان زیادہ دیر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے۔

کانگرس 1885ء میں قائم ہوئی۔ اور اس کے قیام کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کی مہم شروع کر دی۔ ہندو مسلم اتحاد سے مایوس کر دیا۔ سر سید نے مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کی۔ اسمبلیوں کے جداگانہ انتخاب پر زور دیا۔ قائدِ اعظم بھی پہلے پہل ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلائے لیکن ہندوؤں کی منفی روش نے انھیں علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کی راہ دکھائی۔ مفکر پاکستان علامہ اقبال نے بھی ابتدائی دور کی نظموں میں متحدہ قومیت کے گن گائے لیکن جلد ہی اسلامی تشخص کے عظیم علمبردار بن کر ابھرے۔ ہندوؤں نے متحدہ قومیت کا نعرہ اپنے خاص منفی مقاصد کے حصول کے لیے لگایا تھا۔ ہندو برصغیر میں اکثریت میں تھے۔ ہندوؤں کو علم تھا کہ انگریز چلے گئے تو انتخابات کے نتائج کے مطابق حکومت ہمیشہ کے لیے ان کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ اس طرح سے ہندوؤں کا مسلمانوں پر حکومت کرنے کا دیرینہ خواب پورا ہو جائے گا۔ مفکرین اس نکتے پر بھی غور کریں کہ اگر ہندو ہندوستان میں اقلیت میں ہوتے اور انگریزوں کے جانے کے بعد مسلمانوں کی حکومت بننا ہوتی تو کیا پھر بھی ہندو متحدہ ہندوستان کی بات کرتے؟ کیا پھر بھی ہندو تقسیم ہندوستان کے مخالف ہوتے؟ ہندو دراصل مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے

قائدِ اعظم نے فرمایا تھا کہ انگریزوں کے بعد مسلمان متعصب ہندوؤں کی غلامی میں آنا تو ایک طرح سے آقاؤں کی تبدیلی ہو گا۔ ان حالات میں ہندوستان کی تقسیم اور قیامِ پاکستان ناگزیر تھا۔

تقسیم ہند کی متعدد تجاویز سامنے آئیں۔ 1890ء میں مولانا عبد الحلیم شررؔ نے تقسیم ہند کی ایک تجویز پیش کی۔ 1917ء میں عبد الجبار خیری اور پروفیسر عبد الستار خیری نے ہندوستان کو مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش اور لالہ لاجپت کی طرف سے بھی تقسیم ہند کی تجاویز پیش ہوئیں۔ 1920ء میں عبد القدیر بلگرامی نے "گاندھی کے نام کھلا خط" کے نام سے ایک پمفلت شائع کیا اور تقسیم ہند کی مفصل تجویز پیش کی۔ یہ تجویز علامہ اقبال کی اس تجویز سے بہت مشابہ تھی جو اقبال نے الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں پیش کی۔

1919ء میں خلافت اور ترکی کی حمایت میں مسلمانانِ ہند نے تحریک خلافت شروع کی۔ ہندوؤں نے اپنے مفادات کی خاطر اس تحریک میں شمولیت اختیار کی اور مسلمانوں سے ہمدردی جتائی۔ مسلمان ہندوؤں کے بچھائے ہوئے دام ہم رنگ زمین کو نہ سمجھ سکے اور یوں اس خالص اسلامی تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ہندوستان کے در و دیوار نے "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا نعرہ سنا۔ بعض مسلمانوں نے افراط و تفریط سے کام لیا اور ہندوؤں سے وفا کی امیدیں وابستہ کر لیں۔ تحریک ترک موالات اور تحریک ہجرت میں مسلمانوں کو مالی و سیاسی نقصان اٹھانا پڑا۔ پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری صدر شعبہ اسلامیات علی گڑھ یونیورسٹی نے اپنی تحریروں میں ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کی مخالفت کی۔ اس عہد میں امام احمد رضا خان نے مسلمانوں کی علمی و سیاسی رہنمائی فرمائی۔ انہوں نے فرمایا کہ مسلمانوں کی ابھی صرف ایک آنکھ کھلی ہے۔ جس طرح انگریز مسلمانوں کا دشمن ہے۔ اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ انگریز ہوں یا ہندو، مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ ان سے دلی دوستی کی پینگیں بڑھائیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کر جانے کی ترغیب دینے والوں کی عاقبت نااندیشی پر بھرپور اور مدلل تنقید کی۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور نئے انداز سے اجاگر کیا۔ انھوں نے واشگاف انداز میں فرمایا کہ اسلام میں قومیت وطن، نسل، رنگ اور زبان کی بنیاد پر نہیں، دین کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے۔ اقبال نے نظریہ وطنیت پر زبردست تنقید کرتے ہوئے فرمایا:

؎ اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت تھی نہیں

اقبال کے تدبر و حکمت کا عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے دام فریب کی اصلیت سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اقبال نے دو قومی نظریے کی جو شمع روشن کی اسی کو تھام کر مسلمانوں کا قافلہ رواں دواں رہا اور آزادی کی منزل قریب آتی گئی۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ دو مختلف اور مستمیز معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال سمجھنا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترک قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ قوم کی کسی بھی تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کا اپنا وطن، علاقہ اور مملکت ہونی چاہیے۔

23 مارچ 1940ء کو قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی۔ مسلمانوں نے قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں ہزاروں قربانیاں دے کر 14 اگست 1947ء کو پاکستان حاصل کر لیا۔ زندہ قومیں ہمیشہ اپنے مذہبی اور قومی تہوار بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے مناتی ہیں تاکہ ان دنوں کی یاد تازہ رہے اور آنے والی نسلیں بھی ان کی اہمیت سے آگاہ ہو سکیں۔ یومِ آزادی اور یوم پاکستان ہمارے لیے تجدید عہد کا دن ہے اور آج بھی اقبالؔ کے پیغام کی یاد دلاتا ہے:

؎ یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغ چمن اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

د: معاشرے پر سوشل میڈیا کے اثرات

معاشرے سے مراد کسی جگہ یا علاقے کے لوگوں کا طرز زندگی ہے جس میں ان کے خانگی اور شہری تعلقات قائم ہوں۔ اس تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم انسانی تعلقات کی نوعیت کی بات کرتے ہیں تو اس میں پہلی چیز خبر یا معلومات آئیگی۔ انسان کی اپنے اردگرد اور دنیا میں ہونیوالے معمولی واقعہ سے لے کر اہم واقعات کے بارے میں جانکاری کی طلب صرف خواہش نہیں بلکہ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ ٹیکنالوجی کی جدت نے دنیا کو ایک الیکٹریکل مارکیٹ یا گلوبل ویلج کی صورت دے دی ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ مثلاً فیس بک، ٹویٹر، گوگل پلس، لنکڈ ان، انسٹاگرام، یوٹیوب وغیرہ نے موجودہ دور کے نفوس کو اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ دنیا بھر میں سوشل میڈیا کے استعمال سے دلچسپی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ معاشروں کے وجود ابلاغ کی ہی مرہون منت ہیں۔ ہر طرف پیغامات کی لہروں کا سمندر موجزن ہے۔ میڈیا کا دائرہ ہر انسان کے گرد اپنا گھیرا تنگ سے تنگ کرتا جارہا ہے۔ انسانوں کا انسانوں سے رابطہ خود انسانی معاشرے کی بقا کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ان کی دیگر مادی ضروریات، ابلاغ انسان کی انفرادی ضرورت بھی ہے اور معاشرتی بھی۔

سوشل میڈیا کا ایک بہت اہم مقصد آگہی و رہنمائی کی فراہمی ہے۔ اس عہد میں خبریں ایسی روشنی ہیں کہ اگر انسان تک نہ پہنچیں تو ذہن تاریک ہو جائیں اور دنیا سے رابطہ ٹوٹ جائے۔ آگہی فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے مثلاً موسمی پیش گوئی کے پیشِ نظر لوگ اپنی دن بھر کی مصروفیات کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی اور تربیتی پروگراموں کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً ماہرین اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کرتے ہیں اور قومی سطح پر سائنس، ٹیکنالوجی، تاریخ، دینیات، معاشیات، سیاسیات، صنعت و تجارت، ثقافت و ادب غرض ہر موضوع پر قارئین، ناظرین اور سامعین کی معلومات میں وسعت کا باعث بنتے ہیں۔

سوشل میڈیا کے ذریعے معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ ان کا پردہ چاک کیا جاسکتا ہے اور یوں عوامی خدمت کا فریضہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ بدعنوانی، رشوت ستانی، چوری، ڈکیتی، فراد اور دیگر معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کر کے اصلاح احوال کا پروگرام پیش کرنے کے لیے سوشل میڈیا کے ذرائع کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

سوشل میڈیا نے بہت سے خوفناک رازوں پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ فلسطین، کشمیر، چین اور دیگر ملکوں میں مسلمانوں کے وحشیانہ قتلِ عام کی خبر ہو یا یمن میں قحط اور بھوک کے سبب ننھے بچوں کا اپنے جسم کو خوراک کا ذریعہ بنانا ہو، ان سب کی آواز سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا تک پہنچ رہی ہے۔ معروف اداکار، گلوکار، ماڈلز غرض خواہ تعلق میڈیا کے کسی بھی شعبے سے ہو سوشل سائیٹس اور لنکس کے ذریعے ہی مظلوم انسانوں کی آواز، ان کی آہ و پکار دنیا کے کونے کونے تک پہنچا رہے ہیں۔

سوشل میڈیا حسب ضرورت، انتخاب، پسند اور ترجیح جیسے مدارج طے کر گئی ہے۔ سوشل میڈیا سے قبل اخبارات، جرائد اور ٹیلی ویژن یکطرفہ اظہار کا ذریعہ تھے، جنہیں میڈیا نے دوطرفہ اظہار کی مدد سے زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔ دوطرفہ اظہار کی بدولت ذہنی وسعت اور ایک نظریے کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ سیاسی رہنماؤں اور صحافیوں کی اکثریت اظہار کے لیے سوشل میڈیا کے مقبول ذریعے 'ٹویٹر' سے استفادہ کر رہی ہے جس کے صارفین کی تعداد کروڑوں میں ہے، جن میں امریکہ کے صدر سے لیکر پاکستان و بھارت کے وزرائے اعظم اور دنیا کے سبھی ممالک کے فیصلہ سازوں کی کسی نہ کسی صورت موجودگی اس حقیقت کا بیان ہے کہ سیاست ہو یا صحافت، اظہار کے لیے سوشل میڈیا ہی پہلا انتخاب اور ترجیح بن چکا ہے۔ سوشل میڈیا نے ذرائع ابلاغ کے نئے اسلوب متعارف کروائے ہیں جیسا کہ بَز فیڈ (Buzz Feed) اور لیڈ بائبل وغیرہ جب کہ خبروں، اطلاعات اور معلومات تک رسائی کے لیے نت نئی سہولیات کا اجرا مسلسل ہو رہا ہے، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ساتھ وجود میں آنے والے ذرائع ابلاغ کے نئے ادارے صرف اور صرف سوشل میڈیا کا احاطہ کرتے ہیں جن کے مطالعے سے سوشل میڈیا کے رجحانات اور مقبول اسلوب کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

درحقیقت سوشل میڈیا کی بدولت جو اپنی طرز کی انوکھی مشکل پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اب خبروں کی کمی نہیں رہی بلکہ بہتات ہو گئی ہے اور اس لمحہ بہ لمحہ خبر نگاری نے پیشہ ور صحافیوں کے شانہ بشانہ سوشل میڈیا صارفین کو لا کھڑا کیا ہے جو ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کی خدمات، تجربے اور رسائی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ایسی سینکڑوں ہزار مثالیں موجود ہیں جن سے تعمیری و تحقیقی صحافت نے جنم لیا ہے۔ سوشل میڈیا سے قبل کسی خبر کی تصدیق کے لیے ادارہ جاتی ساکھ کو دیکھا جاتا تھا اور اب کسی خبر کی ذیل میں آن لائن تبصروں سے اس کے مندرجات کی سچائی اور ان سبھی ضمنی پہلوؤں سے شناسائی حاصل کی جاتی ہے۔

سوشل میڈیا ایک طرف تو رہنمائی، معلومات، ذہنی وسعت، دنیاوی پرکھ کا باعث بن رہا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے قارئین کو محفوظ کرنے کے لیے انٹرٹینمنٹ اور تفریح کا بھی بڑا ذریعہ بن رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان نسل نے اپنے قیمتی وقت کا بیشتر حصہ سوشل میڈیا کے لیے وقف کر دیا ہے۔

سوشل میڈیا سے بننے والے اس نئے سماج نے انسان کو ایک نئی سماجی زندگی میں لا پھینکا ہے۔ سوشل میڈیا ایک طرف تو جان کاری کا گھر تو دوسری طرف جھوٹی خبروں کا ایک خبرستان ہے۔ چونکہ سوشل میڈیا کا بیشتر استعمال فون کے ذریعے ہوتا ہے۔ لہٰذا فون اب ہر کسی کی ضرورت بن چکا ہے۔ جہاں کاروباری لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہیں طالب علموں کے بے جا استعمال کی بدولت یہ وقت کے ساتھ ساتھ ناگزیر ہوتا جارہا ہے، یہاں

تک کہ گھریلو خواتین بھی اس کے بغیر گزارا نہیں کر پا رہیں۔ فون کے ساتھ انٹرنیٹ کی سہولت ہی ہمیں سوشل میڈیا کی کھڑکی کی طرف جھانک لینے پر اکساہی لیتی ہے اور انٹرنیٹ کی دنیا تو ہے ہی سات رنگوں کی دنیا، جہاں جس کا جو دیکھنے کو دل کرے وہ میسر ہے۔

درحقیقت ہمارے معاشرے کی مخصوص سوچ کی وجہ سے سوشل میڈیا کے اکثر منفی نتائج ہی سامنے آئے ہیں۔ کبھی اس میڈیم کو ہماری ملکی امن و سلامتی کے خلاف مہم کے لیے استعمال کیا جارہا ہے تو کبھی لوگوں کو عزتوں کے اچھالنے کے لیے۔ حال ہی میں عدلیہ نے یوٹیوب پر قابلِ اعتراض مواد کا نوٹس لیا اور آزادئ اظہار کے قوانین اور دوسروں کے احساسات کو کچلنے کے درمیان فرق کو واضح کیا۔

ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کی بدولت بچوں کا دماغ فعال کردار ادا کر رہا ہے۔ والدین کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کیونکہ ایک مشاہدے سے یہ بات عیاں ہوئی ہے کہ سوشل میڈیا کی بدولت پروان چڑھنے والے بچوں میں نہ صرف خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے بلکہ ان کی شخصیت میں تھکاوٹ، کاہلی، بوجھل پن اور چڑچڑاپن جیسی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔

سوشل میڈیا کو عوام میں جوڑ توڑ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بڑے پیمانے پر میڈیا کے ذریعے معلومات کے منتقل کرنے کے انچارج افراد حقائق کو مسخ کر سکتے ہیں تاکہ لوگوں کو کسی خاص خیال کی تائید یا تردید کے لیے آمادہ کر سکیں۔ سوشل میڈیا کا ایک بہت بڑا خسارہ دین سے دوری ہے جو کہ نوجوان نسل میں افسردگی کا باعث ہے۔ جہاں ایک طرف میڈیا روابط قائم کرنے کا موقع دے رہا ہے وہیں اس کی بدولت ہم اپنوں سے دور بھی ہو گئے ہیں۔ نازیبا اور فحش مواد تک رسائی نے نوجوانوں میں اخلاقی گراوٹ کو جنم دے کر معاشرے سے دور کر دیا ہے اور یہی نوجوان معاشرے کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔

تبدیلی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو نظر آتی ہے اور دوسری وہ جو پوشیدہ ہوتی ہے۔ سوشل میڈیا دوسری قسم کی تبدیلی کا باعث بن رہا ہے، ایک ایسی تبدیلی جو نظریات و عقائد، سوچ اور جذبات میں آرہی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ سب سے بڑھ کر انٹرنیٹ کی بدولت معاشرے میں کتب بینی کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے۔ ایک طرف آن لائن سہولیات کی دستیابی کی وجہ سے لوگ گھر بیٹھے مختلف جابز کے لیے درخواستیں جمع کرا سکتے ہیں، بجلی اور گیس اور دیگر بل جمع کرا سکتے ہیں، اپنے کمرے کے پرسکون صوفہ پر بیٹھے لذیذ اور قسم قسم کے کھانے آرڈر کرا سکتے ہیں تو وہیں اس حد تک سوشل میڈیا پر انحصار نے لوگوں میں کام چوری، کاہلی، سستی اور نت نئی بیماریوں کے شکنجے کا شکار کر دیا ہے۔

غرضیکہ سوشل میڈیا کا یہ حجرہ کسی بھی موضوع کو نہیں چھوڑتا اور کسی بھی موضوع کے کسی بھی پہلو کو پوشیدہ نہیں رکھتا، کسی واقعے کا بس ظہور ہی کافی ہے پھر لیجیے، اس پر تبصروں کے وہ شیڈز آپ کو دکھائی دیں گے کہ جو آپ کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آسکتے ہوں۔ بعض تبصرے گمراہ کن اور بعض بالکل آپ کی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سوشل میڈیا کے میلے کی اسی رنگارنگی سے لطف اندوز ہوں لیکن زندگی میں ایک توازن برقرار رکھیں۔ کتاب سے دوری بھلا کسی کو کیسے کامیاب کر سکتی ہے؟ جوانی کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا خمار اتنا ہے کہ سمجھ ہی نہیں آتی اور وقت گزر جاتا ہے لیکن اسی جوانی کا تقاضا یہ ہے کہ اسی میں مستقبل کے راستوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ ایک غلط فیصلہ انسان کو اس کی منزل سے دور کر دیتا ہے۔

سوشل میڈیا اپنے اندر ایسے رنگ سموئے ہوئے ہے کہ انسان اس کی بھول بھلیوں میں گم سا ہو جاتا ہے اور وقت کی سوئیوں کی رفتار کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی منزلوں کی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے، عیش و عشرت کا دلدادہ، آرام طلب، سہل انگار اور تن آسانی کو ترک کر دے، اپنی نفس پرستی کی جاٹ لگا کر ایک ایسی مصنوعی اور نمائشی زندگی کا خوگر نہ بن جائے کہ جس کی بھول بھلیوں میں پھنس کر وہ اپنے آپ کو، اپنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو، اپنے خالق و مالک کو اور اپنے ہم جنسوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے۔ بقول شاعر:

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں کھیلو ۔۔۔ جائز ہے غباروں میں اُڑو، چرخ پہ جھولو

ہر ایک سخن بندہ عاجز کی رہے یاد ۔۔۔ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

* * * * *